اکیسویں صدی کے ناولوں میں سیاسی شعور

فرخندہ امین، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

Twenty first century has much political importance in its start specially because of 9/11. In this article 21st century urdu novel has been discussed with reference to politicle situation.

پاکستان میں رونما ہونے والے ہر واقعے نے ہمارے ادب بالخصوص ناول پر اثر ڈالا۔ وہ فسادات کا سانحہ ہو یا ہجرت کا کرب، ۱۹۵۸ء کا مارشل لاء ہو یا ۱۹۶۵ء یا ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ، ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء یا مہنگائی اور بے روزگاری کا المیہ، سبھی ہماری قومی زندگی کے ایسے سنگِ میل ہیں جو نہ صرف ہماری تاریخ کا راستہ متعین کرتے ہیں بلکہ ہمارے تخلیقی ادب کا مزاج بھی بناتے ہیں۔

۲۱ ویں صدی میں قومی و بین الاقوامی دونوں سطحوں پر سیاسی و سماجی حالات میں تیزی سے تبدیلی رونما ہوئی اور قومی و ملی شعور کی رو تیز ہوگئی جس کی بدولت اُردو ناولوں نے ان سب پہلوؤں کو اپنے اندر ضم کیا اور خارج و باطن کو ساتھ لے کر پوری زندگی کی عکاسی ہونے لگی۔

سیاست انسانی زندگی کا اہم جزو ہے۔ اس کی اہمیت فکشن میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوئی جب سیاسی آویزشوں نے جنگی صورت حال پیدا کی اور اس کے نتیجے میں انسان نے تباہی کے وہ مناظر دیکھے کہ وہ کانپ اُٹھا۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم میں جان و مال کی وہ تباہی دیکھنے میں آئی کہ سابقہ ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ یورپ میں ذہنی وفکری کجی کے حامل افراد نے پوچھنا شروع کر دیا کہ کیا خدا ہے؟ پھر ناول نگاروں کا ایک طبقہ پیدا ہوا جس نے سیاست کو بھی تاریخی و معاشرتی صورت حال کے ساتھ جوڑ کر دیکھا۔ برصغیر میں آزادی کی تڑپ نے جو سیاسی صورت حال پیدا کی اور سیاسی جماعتوں نے جس طرح اس عظیم مقصد کے لیے جدوجہد کا مظاہرہ کیا وہ ناول کا بھی حصہ بنا۔

ادیب اپنے سماجی و سیاسی حالات سے حد درجہ متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک عام انسان سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ ۲۱ ویں صدی کے سیاسی حالات و واقعات نے اُردو ناول نگاری پر بھی اثرات مرتب کیے۔ وہ شخصیتیں جن کے ہاتھوں میں سیاست کی باگ دوڑ ہوتی ہے، فروغ نہیں پا سکتیں اگر زمانہ موافق نہ ہو، تدبر بے بسی کا نمونہ بن جاتا ہے۔ اگر زمانہ اس کا ساتھ چھوڑ دے کشت وخون بے کار، ملک گیری بے سود ہوتی ہے اگر اس کی پشت پر تہذیبی مقاصد نہ ہوں۔ انھیں تمام باتوں کو اکیسویں صدی کے ناول نگار نے خیالات میں پرویا اور زمانہ موجود کے سیاسی حالات و واقعات کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ اس کی کچھ

مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

اکیسویں صدی میں ایک ناول ''شب گزیدہ سحر'' منظر عام پر آیا جس میں بیان کیا گیا کہ:

''لیکن وہ نہیں جانتی کہ پاکستان کے بھٹو کے بارے میں وہ کیا کر سکتی ہے۔ سرکاری اہل کار نے اُسے بتایا کہ پاکستان میں بھٹو کے خلاف تحریک چل رہی ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق وہ تحریک سی آئی اے نے رجعت پسند مذہبی قوتوں کے ساتھ مل کر کھڑی کی ہے...

ہماری خفیہ اطلاعات کے مطابق سی آئی اے نے اسے ٹاسک دیا ہے کہ وہ بھٹو کو منظر سے ہٹائے اور اگر ممکن ہو تو اس کا صفایا کر دے۔[۱]

یہاں ہم اس ناول میں بیان کیے گئے سیاسی واقعے کے پس منظر میں جائیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ پاکستان کی سیاسی کشمکش میں ایک وزیر اعظم کو پھانسی کے تختے پر چڑھایا گیا جس سے ملک میں عجیب صورتحال رونما ہوئیں۔ سیاسی پارٹیاں اور عام عوام اپنے اپنے مقام پر کس طرح نفسیاتی و ذہنی تبدیلیوں سے روشناس ہوئیں۔ اس ناول میں جو بات بیان کی گئی اُس کا حقیقت سے کس حد تک تعلق ہے، اس بات کا اندازہ ان صحافیوں، کالم نگاروں اور تبصرہ نگاروں کے بیانات سے واضح ہو سکتا ہے کہ اس حقیقت کا پردہ فاش کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ''حسین حقانی'' لکھتے ہیں:

> ''ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۷۷ء میں بھٹو کو معزول کرنے کے بعد انہیں ایک سیاسی مخالف کے قتل کے الزام میں پھانسی پر لٹکا دیا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران استغاثہ کی طرف سے اہم ترین گواہ ایف ایس ایف کا سربراہ تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے اس وعدے پر کہ اسے ''وعدہ معاف گواہ'' قرار دیا جائے گا۔ اس نے عدالت میں بیان دیا کہ اس نے بھٹو کی ہدایت پر قتل کے احکامات جاری کئے تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ بھٹو کی تخلیق نئی سکیورٹی ایجنسی ان کی مدت اقتدار میں اضافے کا باعث بنتی۔ وہ ان کے لیے پھانسی کا پھندہ بن گئی۔''[۲]

اسی بات کی وضاحت سید عالی رضوی ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

> ''ضیا الحق کو برسر اقتدار لانے والی پس پردہ قوتوں کا ایک مقصد ذوالفقار بھٹو کے وضع کردہ ایٹمی پروگرام کے راستے میں روڑے اٹکانا بھی تھا جس کی تصدیق اس فوجی آمر نے کھلے بندوں یہ کہہ کر کر دی کہ پاکستان اپنی دوسری اہم ترجیحات کے باعث ایٹمی پروگرام کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''[۳]

لیکن نواب نصر اللہ خاں کے نزدیک حقیقت کچھ اور تھی اور وہ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

> ''تیسرا مارشل لاء جو جنرل ضیاء الحق نے نافذ کیا اس کا بھی کوئی جواز نہ تھا۔ پی این اے اور ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے مابین سیاسی مفاہمت ہو چکی تھی اور ازسرنو انتخابات کی تاریخ بھی متعین ہو چکی تھی لیکن جنرل ضیاء الحق نے صریحاً غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ حکومت اور اپوزیشن کے درمیان کیونکہ مفاہمت نہیں ہو سکتی اور خانہ جنگی کا خطرہ ہے اس لیے مارشل لاء نافذ کیا جا رہا ہے... جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء کے نفاذ کے ساتھ ہی قوم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تین مہینے میں انتخابات

کرائیں گے۔ ان کے اعلان کو پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد دونوں نے اس بناء پر تسلیم کر لیا کہ اس میں انتخابات کرانے کا وعدہ کیا گیا تھا دونوں پارٹویوں نے انتخابی مہم کا آغاز کیا اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ نہ تو پی این اے کے کسی جلسے میں کوئی ہنگامہ آرائی ہوئی اور نہ پیپلز پارٹی کے جلسے میں کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آیا۔ لیکن اس کے باوجود جنرل ضیاء الحق نے انتخابات کو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سوائے ہوس اقتدار کے اور کوئی جواز نہیں تھا۔''[۴]

اسی صورتحال کو کہانی کی شکل میں انیس ناگی نے بھی ڈھالا ہے۔ وہ اپنے ناول ۳۱۳ بریگیڈ میں لکھتے ہیں کہ:

''سر یہ پھانسی گھاٹ ہے، یہاں ایک وزیراعظم کو پھانسی دی گئی تھی۔''

''ہوں''

''یہ بھی ایک خودکش حملہ تھا۔''

''کیا کہا'' میں نے قدرے حیرت سے اس سے پوچھا ہے؟

''یہاں کی سیاسی تاریخ کو پاش پاش کرنے کے لیے یہ حملہ کیا گیا تھا، اگر وہ چاہتا تو بچ سکتا تھا مگر اس نے بچنے سے انکار کر دیا تھا...'' یہ کہتے ہی اس نے زور سے ایکسیلیٹر دبایا ہے کہ ٹیکسی چیختی ہوئی حد نگاہ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔''[۵]

ان تمام اقتباسات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اکیسویں صدی کا ناول نگار حقیقت نگاری کرتا ہوا کس حد تک اپنے اِردگرد پھیلی سیاست کو اپنے ناولوں کا حصہ بنا رہا ہے۔ جو کہ ایک خوش آئند عمل ہے۔

نئی صدی کے نئے ناول بہت بے باکا نہ اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ تقریباً ہر ناول نگار نے اپنے اپنے تئیں اس سانحے یا سیاسی چپقلش کو اپنے ناول کا حصہ بنایا۔ مستنصر حسین تارڈ اپنے ناول ''ڈاکیا اور جولاہا'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ایسا لگتا ہے کہ فوجی بوٹوں نے کوڑوں اور مارشل لاء کے سر پر لوگوں کے ہونٹ سی دیئے ہیں، پتھر بنا دیئے ہیں لیکن کب تک۔ مجھے اُمید ہے کہ ایک نہ ایک دن آستین کا لہو ضرور پکارے گا۔ البتہ اس بات کا مجھے کامل یقین ہے کہ الیکشن ہوئے تو ہمارے گاؤں سے سوائے ملاؤں کے دو چار ووٹوں کے اور کوئی ووٹ کم از کم اتحاد کو ہرگز نہ ملے گا''۔[۶]

معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے سیاست کے کئی پہلو، کئی شکلیں روز مرہ زندگی میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کیونکہ شاید یہ سیاست ہی ہے جو معاشرے کے ہر معاملے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر حکومت تبدیل ہوتے ہی نیا ایجنڈا آ جاتا ہے۔ جس میں مہنگائی کی شرح نسبتاً بڑھا دی جاتی ہے اور اگر سیاست کے میدان میں اپنے آپ کو مزید منوانا ہو تو موجودہ حکومت یا برسر اقتدار حکومت سے کسی بھی طور نبھا نہ کرنے پر زور دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں کبھی کسی علاقے میں جلوس ور یلیاں نکلتی ہیں تو کہیں پہیہ جام ہڑتال کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سیاسی لوگوں کی آپس کی جنگ میں معصوم عوام پستی ہے۔ اس ساری صورتحال کو بڑے واضح انداز میں اکیسویں صدی کے ناول نگار منظر عام پر لائے ہیں۔ مندرجہ ذیل ناولوں کے اقتباسات پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ادب سیاست سے اور معاشرتی حالات سے کس قدر متاثر ہوا ہے اور مختلف سیاسی پارٹیوں کی حالت

زار پر کس قدر قلم اُٹھایا گیا ہے۔

''پارٹی کے پنجاب سیاسی فرنٹ کے سربراہ کے گھر بہت سے لوگ جمع تھے جو ائیر پورٹ سے تحریک عوام کے مرکزی راہنما علی بخش رند کو جلوس کی صورت میں وہاں تک لائے تھے۔ گویا جلوس بہت بڑا تو نہیں تھا۔ مگر اس سے پہلے کبھی اتنے لوگ بھی ''تحریک عوام'' کے لیڈروں کے استقبال کے لیے جمع نہیں ہوئے تھے۔ چار پانچ سو کے قریب لوگ تھے جو کاروں اور موٹر سائیکلوں کے قافلے کی صورت میں علی بخش رند کا استقبال کر کے یہاں تک لائے تھے۔''۷

''۱۹۷۷ء میں سیف علی نے الیکشن کروانے کا اعلان کیا۔ ایک دن چناب نگر کے ڈپٹی کمشنر نے الیکشن ڈیوٹی پر تعینات تمام پولنگ اسٹیشنز کے انچارج آفیسرز کو ٹاؤن ہال میں بلایا اور ان کو مطلع کیا کہ سیف علی صاحب کی طرف سے براہ راست احکامات آئے ہیں کہ پولنگ کے بعد جتنی بھی پرچیاں باقی بچ جائیں ان سب پر عوامی پارٹی کے امیدواروں کے انتخابی نشان پر مہر لگا کر اسے بیلٹ باکس میں ڈالنا ہے اور اگر کسی جگہ مخالف پولنگ ایجنٹ زیادہ ہی ڈھیٹ ہو جو کہ کھانے وغیرہ کے لالچ میں بھی تھوڑی دیر کے لیے نہ ہلے تو بھی اسے حکم دے کر یا ڈرا کر کم از کم ایک سو پرچیاں ضرور ڈالنی ہیں۔''۸

غرض یہ کہ ملک جن سیاسی حالات یا المیوں کا شکار ہوا۔ اکیسویں صدی کا ناول اُس حقیقت کا عکاس ہے۔ پھر چاہے وہ کوئی جمہوری دور ہو یا مارشل لاء کا دور... دونوں صورتوں میں قوم نے بہت سے مشکل حالات کا سامنا کیا ہے وہ صرف صورتیں بدلتی پریشانیوں سے دبنے کی بجائے اُس کے خلاف آواز بلند کرنے کے قابل ہوگئی ہے۔ آج کا ناول نگار اس قابل ہو گیا ہے کہ وہ بغیر کسی خوف کے جرات مندی سے ان حالات کو قلمبند کرے۔ مثلاً وحید احمد لکھتے ہیں کہ:

''جب ہم ملکی صورتِ حال کو بین الاقوامی تناظر میں دیکھتے ہیں تو کھلتا ہے کہ ہماری سیاسی غربت تو دراصل مفلوک الحالی ہے جس کا سفر پاتال کی طرف ہے۔ آج ہم اس امیر مگر فاتر العقل بھکاری کی طرح ہیں جو اپنی دولت سے یکسر بے خبر ساری دُنیا میں کشکول اُٹھائے بھیک مانگتا ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا ہے کہ دُنیا کے ستم ایجاد اسی بھکاری کا کچھ پیسہ کشکول میں ڈال کر احسان کرتے ہیں۔ رُوح عصر بے چین ہے۔ بین الاقوامی دہشت گردی ایک طرف اور ہمارے ملک میں قیادت کا بحران دوسری طرف۔ چکی چل رہی ہے۔ دونوں پاٹوں میں گیہوں بھی پس رہا ہے اور گھن بھی۔''۹

''قلعہ جنگی'' کے نام سے ۲۰۰۲ء میں ایک ناول منظر عام پر آیا۔ مستنصر حسین تارڑ نے یہ ناول افغانستان کی جنگ کے پس منظر میں لکھا انیس ناگی کے ناول 'کیمپ' کے بعد مستنصر حسین تارڑ کا افغان پس منظر میں یہ ناول سلگتے ہوئے علاقائی مسائل کی حقیقت پسندانہ عکاسی کرتا ہے۔ ''قلعہ جنگی'' ایک سیاسی رجحان کا ناول ہے جس میں کئی نازک سوالات اُٹھائے گئے ہیں جیسے جنگ کے المیوں یا حولناکیوں کا کسے قصور وار ٹھہرانا چاہیے؟ اس جنگ کا ہیرو کون اور ولن کون ہے؟ یا سب کچھ اضافی محسوس ہوتا ہے؟ آخر وہ سچائی کیا ہے جسے سب ہی تسلیم کر سکیں؟ تباہی اور بربادی میں انسانی نفسیات کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے؟ زندگی کی آس

میں پل پل مرتے کردار کس طرح تحفظِ ذات کے لیے یا اپنی بقاء کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں؟ اس ناول کا تو انتساب ہی سب سے پہلے دل دہلا دینے والا ہے ذرا ملاحظہ فرمائیے:

اُن افغان بچوں کے نام جو بارودی سرنگوں کا شکار ہو کر اپاہج ہو گئے اور کسی فٹ بال میچ میں کھلاڑی نہیں ہو سکتے صرف گول کیپر ہو سکتے ہیں۔

جو لوگ افغانستان کی تاریخ سے آگاہ ہیں وہ اس انتساب کی طنز کو بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ افغانستان سے سوویت یونین کے جانے کے بعد امریکن بمباری کا آغاز ہونے پر بہت سے ہم خیال اپنی بقاء کی جنگ لڑتے دکھائے گئے ہیں۔ دراصل افغانستان میں جب جنگ شروع ہوئی تو بہت سے ممالک سے مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرنے کے لیے آئے مگر افغانیوں سے جواباً اچھا سلوک نہ ملا اب وہ اس صورتحال میں ہیں کہ وہ ایک قطعے میں پھنس کے رہ گئے ہیں۔

اگر وہ باہر نکلیں تو شمالی اتحاد والے مار ڈالیں گے اور دوسری صورت میں امریکن بمباری اور موت اُن کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ جب قومی اتحاد نہ ہو اور اس پر ظالم و جابر یک قطبی طاقت بھی مسلط ہو تو اس صورتحال میں بقاء کے حوالے سے دردناک سوالات اُٹھائے گئے ہیں۔ ایک مقام پر کرداروں کو صرف اپنی بقاء کی خاطر ایک مردہ گھوڑے کا گوشت تک کھانا پڑتا ہے اُس وقت اُن کے ذہنوں میں حلال و حرام کا جو سوال جس شدت سے اُٹھتا ہے وہ اُسے اُسی شدت سے ختم کر دیتے ہیں۔

اس حوالے سے یہ دو اقتباسات جو ''امریکی مجاہد عبدالحمید جان واکر'' سے تعلق رکھتے ہیں ناول میں گہری معنویت پیدا کرتے ہیں اور قاری کو سوچ بچار کی دعوت دیتے ہیں کہ:

اسلام نے مجھے مقصدیت دی ہے۔ ایک کاز (Cause) دیا ہے۔ گناہ، ثواب، دوزخ اور بہشت اور بھائی چارے کا ایک تصور دیا ہے۔

لیکن بالکل آخر میں اسی کردار کی خود کلامی ملاحظہ فرمائیے:

یہ تصور کامل ہمیشہ ہار جاتا ہے۔''

اس آخری فقرے میں ایک سوچ بچار کی پیشکش ہے جو کہ بظاہر علامتی نظر آتی ہے۔ اس قسم کی جنگ کی ہولنا کی کو جس نے ہمارے سیاسی سماجی اور مذہبی لحاظ سے سماج پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اس دوہری مشکل صورتحال کو کمال طریقے سے آشکار کیا ہے۔ اس ناول کے اقتباس پر نگاہ ڈالیں تو ایک کرب کی حالت جو کہ ناول نگار نے محسوس کی جس میں وہ ہمیں بھی شریک کرنا چاہتا ہے:

''جہاں بدھ کے مجسمے تھے وہاں اب ایک عظیم چٹانی خلا تھا''

یہ جو محمود غزنوی تھا غزنی کا... جسے ہم بت شکن کہتے ہیں تو اس نے انھیں کیوں نہیں چھیڑا؟

''ہر لاش ایک لاش میں تھی... مٹی سے بھری... شاید سر بریدہ مگر پھر بھی ایک کامل تصور میں تھی۔''

''جانی اور گل شیر... میلے میں کھوئے گئے بچے... کچھ شرمندہ۔''

یہ اتنی خوفناک صورتحال ہے کہ چنگیز خان کے دور میں مشرقِ وسطی میں جس طرح خون کی ندیاں بہائی گئی تھیں، اُسی طرح کے منظر کی یہاں نشاندہی کی جا رہی ہے۔ گویا یہ اکیسویں صدی کے سیاسی صورتحال پر ایک دردناک ناول ہے۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں ایک اہم واقعہ ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر'' کا پیش آیا جس نے نہ صرف ایک ملک بلکہ پوری دُنیا کے ممالک پر خاص طور سے سیاسی تبدیلیاں رونما کیں۔ پاکستان بھی اس سے نہ بچ سکا اور وہ پاکستانی بھی جو امریکہ میں مقیم تھے۔ اکیسویں صدی کے ناولوں میں اس ۹/۱۱ کے واقعے کو بھی جگہ دی گئی اور اُن تمام مسائل کا بھی تذکرہ کیا گیا جو ایک مسلمان اور خاص طور پر ایک پاکستانی کو درپیش ہیں۔ اس کی ایک مثال مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''خس و خاشاک زمانے'' میں ہمیں ملتی ہے۔ اس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''ٹیلی ویژن کے سامنے ایک بے حس اور تاریخی تذبذب کی کیفیت میں سکرین پر نظریں جمائے ورلڈ ٹریڈ ٹاورز کے آشوب، الم ناکی اور شام غریباں کو وہ کب تک تکتا رہتا کہ یہ امریکیوں کے لیے ایک کربلا تھی... اُن کے دو امام جو نہ تو معصوم تھے اور نہ ہی راست باز ''شہید'' کر دیئے گئے تھے۔''[۱۰]

تارڑ نے یہاں دو اماموں کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے کمال خوبصورتی سے طنز کیا ہے۔ اس واقع کے پس منظر میں جائیں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ کس طرح ایک ملک دوسرے ملکوں پر حکمرانی کرنے کی غرض سے سازشیں کرنے کا مرتکب ہوتا ہے۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کے مترادف سیاست میں حکمتِ عملی استعمال کی جاتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک، ترقی پذیر ممالک کو بلیک میل کرتے ہیں اور اپنے مفادات کی خاطر کچھ بھی کر گزرنے کے متحمل ہوتے ہیں۔ اس ۹/ ۱۱ کے واقعے پر پاکستانی صحافی ''قیوم نظامی'' لکھتے ہیں کہ:

''دُنیا کے صرف تین ملکوں پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے طالبان کی حکومت کو تسلیم کر رکھا تھا۔ پاکستان افغانستان کا ہمسایہ ملک تھا لہٰذا پاکستان اس واقعہ سے براہ راست متاثر ہوا۔''

مشرف نے وزارتِ خارجہ کے مشورے پر فوری طور پر دہشت گردی کے اس واقعہ کی سخت الفاظ میں مذمت کی اور امریکہ کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ کولن پاول نے مشرف کو فون کیا اور کہا:

"You are either with us or against us."

آئی ایس آئی کے ڈی جی جنرل محمود امریکہ کے دورے پر تھے۔ انہوں نے مشرف کو فون کر کے بتایا کہ امریکہ کے ڈپٹی سیکرٹری آف سٹیٹ رچرڈ آرمیٹج (Armitage Richard) نے انہیں انتباہ کیا ہے:

"We had to decide whether we were with America or with the terrorist but if we chose the terrorist then we should be prepared to be bombed back to the stone age."[۱۱]

اس بات کی مزید وضاحت پرویز مشرف نے اپنی کتاب "In the Line of Fire" میں کی ہے۔ ان تمام حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتی و سیاسی ایسے پیچیدہ حالات کے پیش نظر اُس وقت کا ادیب یا ناول نگار متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ پھر اُس سے کون کس انداز سے متاثر ہوتا چلا گیا۔ اُن تمام سماجی حالات کو خس و خاشاک زمانے میں واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جہاں ایک طرف مستنصر حسین تارڑ ۹/ ۱۱ کے واقعے کا ردعمل پیش کرتے ہیں وہیں ''انیس ناگی'' دہشت گردوں یا خود کش حملہ آوروں کا ذکر اپنے ناولوں میں کرتے دکھائی دیتے ہیں جنھیں سب طالبان کی صف میں شامل کرتے ہیں۔ امریکہ نے

جن دہشت گردوں کو Point out کیا۔ ہمارے ملک کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا کہ یہاں ایسے حملہ آور پناہ گزین ہیں جس کا سرغنہ اُسامہ بن لادن ہے۔ سو ہمارے ادب نے اس موضوع کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ انیس ناگی کے ناول ''۳۱۳ بریگیڈ'' کا اقتباس اس سلسلے میں ملاحظہ کیجیے:

> ''میں نے اُسے نہیں بتایا کہ میں پارسی ہوں، اور نہ ہی واضح طور پر کہا ہے کہ میں ۳۱۳ بریگیڈ کی کھوج میں ہوں اور کچھ دہشت گردوں سے بھی ملنا چاہتا ہوں کہ اُن کی برین واشنگ کون کرتا ہے اور کس طرح ہوتی ہے۔ خودکش حملہ ایک فلسفیانہ خودکشی ہے جس میں شخصی زندگی ایک مقصد کے تابع ہو کر اپنی انفرادیت سے محروم ہو جاتی ہے، یہ فیصلہ عام حالت میں ممکن نہیں، یہ ایک وجدانی کیفیت ہے، ایک شخص جو اپنے بدن کے گرد ڈائنامائیٹ باندھ رہا ہے، جو اپنے بیوی بچوں اور ہر طرح کے انسانی رشتوں کو محو کر دیتا ہے تو وہ اپنی انسانی حدود سے ماورا ہو جاتا ہے، وہ یہ سب کچھ اپنے لیے نہیں کر رہا ہوتا۔ میں نے ابھی تک خودکش حملہ آوروں کے جو خاکے اور تصاویر دیکھی ہیں، وہ سب کے سب اجڈ، سر کے بال خودکش حملہ آورون کے جو خاکے اور تصاویر دیکھی ہیں، وہ سب کے سب اجڈ، سر کے بال لمبے اور بکھرے ہوئے، داڑھیاں اور ایسے حلیے ہیں جو ایک نیم وحشی کے ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب میں یہاں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ خودکش حملہ آور نیم وحشی ہوتے ہیں، یہ اعتقاد قوت فیصلہ اور قوت ارادی کا کھیل ہے، اس میں تعلیم اور کلچر کا کوئی دخل نہیں ہے، یہ عقل سے ماورا ایک جنون کی کیفیت ہے۔''[۱۲]

یہ انہونی چاہے جس کی بھی واردات ہو لیکن مسلمان خاص طور پر پاکستانی اس سے یعنی تخریبی عناصر اور اس کے ردّعمل سے جان نہ چھڑا سکے۔ وہ پاکستانی جو ایک وقت میں یہ خیال اپنے ذہن سے نکال چکے تھے کہ وہ پاکستانی ہیں اور مسلمان ہیں۔ اس واقع کے بعد اُن میں اپنی گم ہوتی شناخت کو دوبارہ تازہ کرنے کا احساس اُجاگر ہوا اور کئی لوگوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ایک مثال اس ناول ''خس و خاشاک زمانے'' میں ''انعام اللہ'' نامی کردار کی صورت ملتی ہے جو ہر ایک کو کھلے عام کہتا پھرتا تھا ''لیس آئی ایم مسلم'' اس طرح کے سیاسی کشمکش کے دور کو اکیسویں صدی کے کئی ناول نگار اپنے ناولوں میں بیان کر رہے ہیں لیکن کسی بھی ناول میں کسی قسم کے سیاسی سکون کی نشاندہی نہیں ملتی۔ ہر طرف ایک نفسانفسی کا گمان ہوتا ہے۔ رستے سب دکھاتے چلے جا رہے ہیں لیکن منزل کی نشاندہی مشکل ہو رہی ہے۔ آج کے دور کے ناول نگار کو بھی ان سیاسی پیچیدگیوں میں اُلجھ کر ذہنی انتشار کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو اُن کی تخلیق سے واضح بھی ہو رہا ہے مثلاً ''ارشد وحید'' اپنے ناول ''گمان'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ہم نے اپنے اپنے طور پر بہت کچھ سیکھا ہے دیکھا ہے ہم اس ناانصافی سے بے خبر نہیں جو ہمارے ارد گرد ہر جگہ ہو رہی ہے۔ ہم بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جب تک اس نظام کو مکمل طور پر ملیامیٹ کر کے ایک نیا منصفانہ نظام نہ قائم کیا جائے، اس وقت تک حالات بہتر نہیں ہو سکتے۔ مگر بہت ساری باتوں کے بارے میں ہمارا علم کمزور ہے۔ پھر سائنسی انداز میں تجزیہ کرنے کی بھی ہم میں کمی ہے۔ ہم کوئی ایسا سلسلہ بنائیں کہ ہم بنیادی سیاسی اور سائنسی نظروں سے بھی آگاہ ہو جائیں اور دوسرے حالیہ

واقعات کے بارے میں بھی ایک نکتہ نظر قائم کریں۔''[۱۳]

ہمارا سماج جہاں کا ہر کام سیاسی صورتحال سے جڑا ہوا ہے وہاں کے غیر جمہوری رویوں اور قومی سطح پر بے حسی نے اکیسویں صدی کے اُردو ناولوں کو نئے موضوعات دیئے۔ جن میں کسانوں کے حقوق کا مسئلہ، سود خوروں کی چالاکیاں، طبقاتی تفریق، غربت، بھوک یعنی معاشی بدحالی، چوری، ڈاکے اور ڈاکوں میں قتل، جاگیردارانہ نظام، بے ضمیر سیاست، ناسٹلجیا کے شکار لوگ اور انقلاب کی طرف مائل نوجوان ہمارے سماج اور ادب کا حصّہ یا موضوع بنتے نظر آتے ہیں۔ ہم یہ بات بخوبی کہہ سکتے ہیں کہ اکیسویں صدی کے ناولوں میں وہ تمام اہم رجحانات نظر آتے ہیں جو معاشرے میں ہماری سیاست اور سماجی صورتحال کا حصّہ ہیں۔

حواشی:

۱۔ کے۔ اشرف، شب گزیدہ سحر، لاہور: مطبوعات پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۲۱

۲۔ حسین حقانی، پاکستان فوج اور ملاؤں کے درمیان، مترجم: شفیق الرحمٰن میاں، لاہور: دین گارڈ بکس، اشاعت اوّل ۲۰۰۸ء، ص: ۱۰۲

۳۔ عالی رضوی، سید، جمہوریت پر تیسرا شبخون، مشمولہ: جنرل ضیاء کے سیاسی تضادات از خالد کشمیری، لاہور: عکس جہاں پبلی کیشنز، مارچ ۱۹۹۵ء، ص: ۹

۴۔ نواب زادہ نصر اللہ خاں، جنرل ضیاء کے سیاسی تضادات میری نظر میں، ۱۹۹۵ء، ص: ۴

۵۔ انیس ناگی، ۳۱۳ بریگیڈ، لاہور: جمالیات پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص: ۴۷

۶۔ مستنصر حسین تارڑ، ڈاکیا اور جولاہا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲، ص: ۱۴۵

۷۔ ارشد وحید، گمان، لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۱۱ء، ص: ۱۴۹

۸۔ طاہر نعیم، چاند نگر، لاہور: دارالشعور مزنگ، ۲۰۰۸ء، ص: ۳۶

۹۔ وحید احمد، مندری والا، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۵۲

۱۰۔ مستنصر حسین تارڑ، خس و خاشاک زمانے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص: ۵۰۲

۱۱۔ قیوم نظامی، پاکستان امریکہ بنتے بگڑتے تعلقات، لاہور: جہانگیر بکس، س ندارد، ص: ۱۵۳۔۱۵۴

۱۲۔ انیس ناگی، ۳۱۳ بریگیڈ، ص: ۴۶۔۴۷

۱۳۔ ارشد وحید، گمان، ص: ۱۲۵

☆☆☆